

وَفَا تَعْلَقُ بِاللّٰهِ

کی ایک اہم اساس

امین احسن اصلاحی

وفا ایمان کے لازمی اور بنیادی تقاضوں میں سے ہے۔ وفا سے مراد یہ ہے کہ ہم نے اپنے رب سے جو عہد و میثاق کیے ہیں وہ پوری راست بازی کے ساتھ پورے کریں۔ یہ امر واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق دو مضبوط میثاقوں پر قائم ہے۔ ایک وہ میثاق ہے جو اس نے ہمارے پیدا کرنے سے پہلے ہماری ارواح سے لیا ہے اور جس کا ذکر سورہ اعراف میں ہوا ہے:

وَإِذْ أَخَذْنَا مِنْ بُنَيِّ آدَمَ
مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ
أَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ ۖ
أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۚ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا
أَنَّا نَقُودُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ إِنَّا كُنَّا
عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ ۝

اور یاد کرو جب نکالا تمہارے رب
نے بنی آدم سے — ان کی پیشوں سے
ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا
خود ان کے اوپر۔ پوچھا: کیا میں تمہارا
رب نہیں ہوں؟ بولے: ہاں! تو ہمارا
رب ہے۔ ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ہم نے
اس لئے کیا کہ مبادا قیامت کو تم عذر
کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے۔

(الاعراف: ۱۷۲)

عہدِ فطرت

یہی وہ عہد ہے جس کو قرآن نے عہدِ فطرت سے بھی تعبیر فرمایا ہے:

فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ
عَلَيْهَا ۚ (الروم: ۳۰)

اس دینِ فطرت کی پیروی کرو جس پر
اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا۔

اس عہد میں جس طرح توحید کا اقرار شامل ہے اسی طرح تمام بنیادی نیکیوں کے نیکی اور تمام بڑی برائیوں کے برائی ہونے کا شعور بھی شامل ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے خود انسان کے نفس کو اس کے اوپر ایک جہت کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سورہ شمس میں فرمایا ہے:

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا
فَالْهَمَّهَا فَجُورَهَا وَتَقْوَاهَا
قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ
خَابَ مَنْ دَسَّاهَا

اور شاہد ہے نفس اور جیسا کچھ اس کو
سنوارا، پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی
اور نیکی کی۔ کامیاب ہو جس نے اس
کو پاک کیا اور نامراد ہو جس نے اسکو
(الشمس: ۷-۱۰) آلودہ کیا۔

اسی عہد فطرت کی بنا پر ہر سلیم الخواص انسان توحید اور بنیادی نیکیوں اور بدیوں سے متعلق، قیامت کے دن مسئول ہوگا۔ خواہ اس کو کسی نبی کی دعوت پہنچی ہو یا نہ پہنچی ہو۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے ہر انسان پر جہت تمام کر دی ہے۔ اس کے بعد کوئی شخص، جیسا کہ سورہ اعراف کی مذکورہ بالا آیت سے واضح ہے، یہ نہیں کہہ سکتا کہ: اِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ (الاعراف: ۱۷۲) (ہم تو ان باتوں سے بے خبر ہی رہے)۔

قرآن کے نزدیک اس عہد فطرت کا اذعان و یقین انسان کے اندر اتنا حکم ہے کہ کوئی شخص اپنے رب کی کوئی نافرمانی کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عین اس کے سامنے اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ چنانچہ سورہ قیامت میں فرمایا ہے: بَلْ يَرَوِ الْاِنْسَانَ لِفَتْحِ غَمَامٍ (الغیۃ: ۵) (بلکہ انسان چاہتا ہے کہ عین اپنے رب کے سامنے اس کی نافرمانی کرے)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا اپنا ضمیر خدائی کو تو ال کی حیثیت سے اس کو عہد فطرت کی یاد دہانی کرتا رہتا ہے اور خود اپنے ضمیر کی تنبیہ کوئی دوسرا سنتا ہو یا نہ سنتا ہو، لیکن آدمی خود اس کے سامنے سے قاصر نہیں رہتا اگرچہ وہ کتنی ہی سخن سازیوں کرے: بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِيْرٌ وَّلٰوْ اَلْقٰی مَعَادٍ يُرٰوُ (الغیۃ: ۱۵-۱۴) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر جہت ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے)۔

اگرچہ ایک بہانہ بازی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کو نہ تو اس طرح کا کوئی عہد ہی یاد ہے اور نہ وہ اپنے اندر اس طرح کی کوئی خلش ہی محسوس کرتا جس کو ضمیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن آدمی سے اپنا باطن

باطن کی یہ آواز کسی خارجی دلیل و شہادت کی محتاج نہیں ہوتی ہے۔ اس کی دلیل و شہادت خود اس کے اندر ہی ہوتی ہے۔ خارج کی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی اس سے زیادہ واضح نہیں ہے کہ اس سے اس پر کوئی دلیل قائم کی جاسکے۔ اس کی دلیل بس یہ ہے کہ انسان اس کو اپنے اندر رہا ہے اور ایسے تو اترو تسلسل اور ایسی وضاحت و قطعیت کے ساتھ پارہا ہے کہ اس کی کسی طرح بھی تمکذیب نہیں کر سکتا الا آنکہ وہ ہٹ دھرمی سے کام لے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مشہور فلسفی کانٹ نے اسے اندرونی آواز INNER VOICE کو فلسفہ و منطق کے طریق احتجاج و استدلال کی گرفت سے بالکل بالاتر قرار دیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی یہ بات نہایت گہری حکمت پر مبنی ہے۔

یہ بات کہ انسان بدی کے بدی ہونے اور نیکی کے نیکی ہونے سے از روئے فطرت واقف ہے یوں بھی ثابت ہے کہ اگرچہ وہ خود دوسروں کے ساتھ بدی کرتا ہے، لیکن وہی بدی اگر دوسرا اس کے ساتھ کرے تو اس کو ظلم و نا انصافی ٹھہراتا اور اس کے خلاف احتجاج کرتا ہے یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ وہ نیکی اور بدی کے شعور سے عاری نہیں ہے، لیکن خود فربہ کے سبب سے اپنے لئے تو دوسروں سے وہ نیکی چاہتا ہے، لیکن دوسروں کے ساتھ بدی کی آزادی کا بھی خواہاں ہے۔ سورہ مطففین میں قرآن نے اس کی اس کمزوری سے پردہ اٹھایا ہے:

وَبَلَّغْنَا الْمُطَفِّفِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا
اُتُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝
وَإِذَا كَانُوا لَهُمْ أَوْزَارًا ثَوْرًا
يُحْسَرُونَ ۝ (المطففين: ۳۱)

میشاق شریعت

اگرچہ انسان پر جنت قائم کرنے اور اس کو مستوجب جزا، و سزا قرار دینے کے لئے یہ عہد فطرت

بھی کافی تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر مزید یہ فضل فرمایا کہ اپنے نبی اور رسول بھیج کر اور اپنی شریعت نازل کر کے اس عہدِ فطرت کو بالکل واضح اور مبرہن اور ہر پہلو سے جامع و مکمل بھی کر دیا کہ کسی گمراہی میں پڑنے کے لئے کوئی رخصت باقی نہ رہے تاکہ جو ہلاک ہو وہ اتنا مہم جت کے بعد ہلاک ہو اور جو زندگی کی راہ اختیار کرے وہ بھی دلیل کے ساتھ اختیار کرے۔

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ
وَيَحْيِيَ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ
تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے حجت دیکھ کر
ہلاک ہو اور جسے زندگی حاصل کرنی ہے
وہ حجت دیکھ کر زندگی حاصل کرے۔
(الافعال: ۳۲)

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ شریعت انسان کے لئے کوئی اوپری اور انوکھی چیز نہیں ہے۔ بلکہ یہ عہدِ فطرت کے اوپر ایک دوسرا میثاق ہے جس نے سابق میثاق کو مزید موکد و موثق کر دیا ہے، جس سے گمراہی کی ہر راہ مسدود ہو گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کو یوں کہئے کہ شریعت کی حیثیت انسان کے لئے تاریکی کے اوپر روشنی کی نہیں، بلکہ روشنی کے اوپر روشنی کی ہے۔ جیسا کہ سورہ نور میں ارشاد ہے: نُورٌ عَلَى نُورٍ (النور: ۳۵) روشنی کے اوپر روشنی، اس سے انسان کا باطن اور ظاہر، دونوں جگہ گھٹتے ہیں۔ یہ تمثیل قرآن مجید میں یوں بیان ہوئی ہے:

اللَّهُ نُورٌ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
مِثْلُ نُورِهَا كَمْ شُكُوا فِيهَا
مِصْبَاحٌ مِصْبَاحٌ فِي زُجَاجَةٍ
الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ
يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ
لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ
رَاسُهَا يُشْفَىٰ بِوَلْوِلَةٍ تَمْسُكُهُ
تَارٌ عَلَى نُورٍ
اللہ ہی آسمانوں اور زمین کی روشنی
ہے۔ دل کے اندر اس کے نور یا مان کی
تمثیل یوں ہے کہ ایک طاق ہو جس میں
ایک چراغ ہو، چراغ ایک شیشہ لکند
ہو، شیشہ ایک چمکتے تارے کی مانند ہو۔
چراغ ایک ایسے شاداب درخت زیتون
کے روغن سے جلایا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو
نہ غربی۔ اس کا روغن اتنا شفاف ہو کہ
گویا آگ کے چھوئے بغیر ہی بجھ کر

(النور: ۳۵)

بجھ کر روشنی کے اوپر روشنی!۔

شریعت کے عہد میثاق ہونے کا ذکر قرآن میں اتنی کثرت سے ہوا ہے کہ اس کے حوالے نقل کرنا تحصیل حاصل ہے۔ بعض عظیم سورتوں کا تو موضوع ہی اس میثاق کی عظمت و اہمیت اور اس کی ذمہ داریوں کی توضیح و تفصیل ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری وفاداری کے ساتھ اس میثاق کی پابندی ہی پر بندوں کی دنیا اور آخرت، دونوں کی فلاح کا انحصار ہے۔ اس میثاق میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کے حقوق اور فرائض، دونوں تفصیل سے بیان کر دیے ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ بند اپنے فرائض اور وفاداری سے پورے کرے گا تو لازماً وہ اپنے حقوق اللہ تعالیٰ سے حاصل کریں گے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور اگر اس کی خلاف ورزی کرے گا تو اس سے بے وفائی کی سزا اس عالم میں جگائیں گے اور آخرت میں بھی۔

سورۃ مائدہ میں اس میثاق کا ذکر اس طرح ہوا ہے:

وَإِذْ كُنَّا نُصَدِّقُكَ عَلَىٰ نَفْسِكَ
وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمُ
بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا
وَإِتَّقُوا اللَّهَ، إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ
بِذَاتِ الصُّدُورِ

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جب کہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ سینوں کے بھیدوں

سے بھی باخبر ہے۔

(المائدہ: ۷)

اس آیت میں نَصَدِّقُكَ اللہ سے مراد شریعت الہی ہے جو سب سے بڑے فضل کی حیثیت سے اس امت کو حاصل ہوئی اور میثاق سے مراد وہ عہد و پیمان ہے جو اس شریعت پر پوری راست بازی اور کامل وفاداری سے عمل کرنے اور عمل کرانے کا لیا گیا اور پوری امت نے سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا کہہ کر اس عہد کی پابندی کا اقرار کیا۔ اگرچہ یہ اقرار اول اول امت کے ہر اہل بیت یعنی حضرات محابر رضی اللہ عنہم اجمعین ہی نے کیا، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی مخاطب وہی تھے، لیکن ہم بھی اس عہد و اقرار میں برابر کے شریک ہیں اگر ہم ان مقدس اسلاف کی خلعت ہونے کی مدد ہی ہیں اور اس شرف سے محروم ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

وفاداری بشرط استواری:

اس دورے میثاق کی ذمہ داریوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا کوئی سہل بازی نہیں ہے۔ یہ بڑے جان جو حکم کا کام ہے۔ اس میں ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہیں جن سے صرف وہی عہدہ برا ہو سکتے ہیں جن کو توفیق الہی کا بدر قر حاصل ہو۔ اس میثاق کا صحیح صحیح حق ادا کرنے کے لئے اس حقیقت کو ہر وقت مستحضر رکھنا ضروری ہے کہ یہ حق صرف چند رسوم ادا کر دینے سے پورا نہیں ہوتا، بلکہ پوری صداقت اور عزیمت کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے برحکم کی تعمیل اس کی شرط اول ہے اگرچہ اس راہ میں جان و مال اور کنسہ و خاندان، ہر چیز کو قربان کر دینا پڑے۔ ہم سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جن قوموں سے میثاق لیا جب انھوں نے محض شریعت کے چند رسوم ادا کر کے اس کے وفاداروں میں نام لکھوانے کی کوشش کی تو اس نے ان کو ٹھکرا دیا کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے نام نہاد مدعیان وفاداری کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ، دونوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَتُجْوَهِتُمْ
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ
الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ
وَأَتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ
وَالْيَتَامَىٰ وَالسَّائِلِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ
وَالسَّائِلِينَ فِي الرِّقَابِ ۖ
وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ
وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا
عَاهَدُوا ۚ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ
وَالضَّرَآءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ۚ أُولَٰئِكَ
الَّذِينَ يُصَدِّقُونَ فَوَاقِدَ جَهَنَّمَ ۚ

خدا کے ساتھ وفاداری محض یہ نہیں ہے
کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف رخ
کرو، بلکہ وفاداری ان کی وفاداری ہے
جو اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر،
کتاب پر اور نبیوں پر صدق دل سے
ایمان لائیں اور اپنے مال اس کی محبت
کے باوجود، قربت مندوں، یتیموں، مسکینوں،
مسافروں، سائلوں اور گریز چھڑانے
پر خرچ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ
ادا کریں جب معاہدہ کر بیٹھیں تو اپنے
عہد کو پورا کرنے والے ہوں۔ خاص کر
وہ جو جہنم کے فواید کا لیس جہانی اور

اور جنگ کے اوقات میں ثابت قدم

رہنے والے ہوں۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے

راست بازی دکھائی اور یہی لوگ ہیں جو

بچے متقی ہیں۔

(البقرہ: ۱۷۷)

آیت کی تفسیر

اس آیت نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئی وفاداری کے تمام تقاضے پوری وضاحت سے بیان کر دیے ہیں۔ اس وجہ سے ہم اس کے بعض اہم اجزاء کی شرح کر کے ان کا مفہوم اچھی طرح واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ اوپر ہم نے جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں سے ہر بات، قرآن کی روشنی میں مبرہن ہو جائے۔ اس آیت میں لفظ 'بَتُّ' جو آیا ہے اس کا ترجمہ عام طور پر ہمارے مترجم نیکل کرتے ہیں۔ لیکن یہ اس لفظ کا ادھورا ترجمہ ہے، جس سے اس کا پورا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ قرآن اور کلام عرب میں اس لفظ کے مواقع استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا صحیح مفہوم 'وفاداری' ہے۔ ہم نے اپنی تفسیر تذبذب قرآن میں اس کی تحقیق بیان کی ہے۔ اس مادے سے لفظ 'بَتُّ' بھی ہے جس کے معنی وفا شعار اور فرماں بردار کے ہیں، مثلاً 'بَتُّ بَوَالِدَيْهِ' اس بیٹے کو کہیں گے جو اپنے ماں باپ کا نہایت وفادار اور ان کے حقوق ادا کرنے والا ہو۔ اسی طرح 'بَتُّ' اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے جو عہد و پیمان اور جو وعدے کئے ہیں وہ سب ایک دن لازماً پورے کرنے والا ہے۔

اس روشنی میں 'لَيْسَ الْبِرُّ أَنْ تَتَّقُوا اللَّهَ' الایہ کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کا حق صرف اتنے سے ادا نہیں ہو جاتا کہ رخ مشرق کی طرف کر لیا یا مغرب کی طرف۔ یہ تو محض دین کے ظواہر ہیں۔ اصل وفاداری اور دین داری تو ان لوگوں کی ہے جو اللہ پر اور رزق پر، فرشتوں پر، کتاب الہی پر سچا اور پکا ایمان لائیں اور ساتھ ہی قربت مندوں، یمینوں، مسکینوں، مسافروں، سالموں اور غلاموں کی آزادی کے لئے اپنے مال خرچ کریں۔

یہ بات جیسا کہ ہم مذکور اخبار کا نام ہے، اللہ تعالیٰ کے مطالب کے فرمانی گئی ہے۔

جن کے ہاں ایک خاص دور میں یہ بحث کہ قبلہ مشرق کی طرف ہے یا مغرب کی طرف اس زور شور سے چھڑی ہوئی تھی کہ گویا تمام دین کا انحصار بس اسی چیز پر ہے دراصل ایک دین کی بنیادی باتوں یعنی ایمان کے تقاضوں اور اس کے عملی مطالبات کا کسی کو بھی احساس نہیں تھا۔ ان کو مخاطب کر کے تنبیہ فرمائی گئی کہ نادانوں، ان ظاہری رسم و ریلوں سے خدا کی وفاداری کا حق ادا نہیں ہوتا۔ خدا کا حق ادا کرنے والے وہ لوگ بنیں گے جو ایمان کے حقیقی عقائد اور عملی تقاضے پورے کرنے والے ثابت ہوں گے۔ یہ اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ سیدنا مسیح علیہ السلام نے یہود کو فرمائی کہ تم پھر کو تو چھانٹے ہو پر اونٹ کو نگل جاتے ہو، یا یہ کہ تم رکابی کو اوپر سے تو صاف کرتے ہو پر وہ اندر لوٹ کے مال سے بھری ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات نگاہ میں رکھنے کی ہے کہ ایمان کے عملی تقاضوں میں سے سب سے پہلے انفاق کا ذکر آیا ہے حالانکہ قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ ایمان کے بعد وہ بالعموم نماز کا ذکر کرتا ہے، لیکن یہاں نماز کا ذکر موخر ہو گیا ہے۔ پھر مزید قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایتائے مال کے ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا ذکر الگ ہوا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کے مال میں اللہ تعالیٰ کا حق صرف زکوٰۃ ہی نہیں، بلکہ اس کے علاوہ بھی ہے اور وفاداری کا مقام حاصل کرنے کے لئے اس کو ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ پہلو خاصی اہمیت رکھنے والے ہیں اس وجہ سے ہم بالا اختصار ان کی وضاحت کی کوشش کریں گے۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہاں ایتائے مال کا ذکر اقامتِ صلوة پر مقدم ہے جو بظاہر قرآن کے معروف اسلوب کے خلاف ہے، لیکن اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ وہ یہ کہ یہاں بتانا یہ مقصود ہے کہ مومن کو اللہ تعالیٰ کی کامل وفاداری کا مرتبہ و مقام کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ اس سوال کا واحد جواب قرآن کی روشنی میں یہی ہے کہ یہ مرتبہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں محبوب مال کے انفاق سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام میں ارشاد ہے: **لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ** (ال عمران: ۹۲) (تم خدا کی وفاداری کا درجہ ہرگز نہیں حاصل کر سکتے جب تک ان چیزوں میں سے نہ خرچ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو) بالکل یہی بات یہاں **ذَاتِ الْمَالِ عَلَىٰ حُبِّهِ** کے الفاظ سے فرمائی ہے یعنی وہ اپنے مال، ان محبوب چیزوں سے خرچ کرے۔

کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مال بجائے خود اعلیٰ اور قیمتی ہو، دوسرا یہ کہ زمانہ ایسا ہو کہ اس میں وہ مال کیاب ہو۔ مثلاً زمانہ قحط یا گرانی کا ہو۔ تیسرا یہ کہ آدمی کو خود اس مال کی احتیاج ہو لیکن وہ اپنی ضرورت پر اللہ کے دوسرے بندوں کی ضرورت کو ترجیح دے: **يُوْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلِكُلّٰنَ بِهِمْ مَخَاصِئُ (المختار: ۹)** (وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انھیں خود احتیاج ہو یہاں 'عَلٰى حُسْبِهِ' کے الفاظ ان تمام پہلوؤں پر حاوی ہیں۔

رہا دوسرا سوال کہ کیا زکوٰۃ کے علاوہ مسلمان کے مال میں اللہ تعالیٰ کے کچھ اور حقوق بھی ہیں جن کا ادا کرنا مہربرو و وفا حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ زکوٰۃ مسلمان کے مال میں سے وہ کم سے کم مطالبہ ہے جس کا پورا کرنا اسلامی حکومت کی گرفت سے بچنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ مطالبہ پورا کر دینے کے بعد حکومت اس سے کوئی تعرض نہیں کرے گی لیکن اللہ تعالیٰ کا مطالبہ بندوں سے صرف زکوٰۃ کا نہیں ہے بلکہ اتفاق کا ہے جو سزا بھی ہو اور علانیہ بھی "اقرض" کا مطلب یہ ہے کہ اگر ملت کو کوئی ناگہانی ضرورت یا حالت جنگ یا قحط یا کوئی آفت کے باعث کوئی ناگزیر حاجت پیش آجائے تو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں دل کھول کر خرچ کریں۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے ذمہ قرض کی حیثیت سے قبول فرمائے گا اور قیامت میں اس کو ایک عظیم خزانہ کی صورت میں واپس کرے گا بشرطیکہ یہ قرض، قرض حسن ہو۔ اس اتفاق کی آخری حد یہ مقرر فرمادی ہے کہ اس طرح کے حالات میں آدمی اپنے اور اپنے بیوی بچوں کو ناگزیر ضروریات سے جو کچھ بچا سکے سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دے **قُلِ الْعَفْوَ** میں 'عفو' کی تفسیر ہمارے نزدیک یہی ہے۔ یہی اتفاق ان لوگوں کے شایان شان ہے جو اللہ کے وفادار اور کامل العیار بندے بننا چاہتے ہیں اور قرآن مجید کے تدبیر سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ یہی اتفاق ہے جس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ اتفاق کرنے والے کو حکمت کا خزانہ بخشا ہے جس کے بارے میں ارشاد ہے کہ **وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا** (البقرہ: ۲۶۹) اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا خزانہ ملا۔

اس آیت میں **وَالْمُؤْمِنُونَ بِحَبْدِهِمْ اِذْ اَعْلَمُوْا** کے الفاظ بھی خاص طور پر غور کرنے کے ہیں۔ اوپر کی باتیں تو فعل کے صیغوں میں بیان فرمائیں، لیکن ایفائے عہد کو صفت کے صیغے بیان کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کا حق ٹھیک ٹھیک وہی لوگ

ادا کر سکتے ہیں جن کے اندر ایسا عہد کی صلت صفت موجود ہو۔ وہ جب کبھی بھی کسی سے کوئی عہد کر بیٹھتے ہوں تو اس کے ایفاء کو اپنی قوت کا لازمی تقاضا اور اپنی حیت کا ایک واجب مطالبہ سمجھتے ہوں۔ اس حقیقت کا اظہار اِذَا عٰهَدُوْا کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ یعنی جب وہ کوئی عہد کر بیٹھتے ہیں تو قول مرداں جاں دارد کے مصداق اس کے لئے جان لڑا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے تمام وسائل کے معاملہ میں جن کا کردار یہ ہو گا وہ اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کے معاملہ میں کبھی کسی کمزوری کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔

وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبٰسَآءِ وَالضَّرَآءِ وَحِيْنَ الْبَآسِ ؕ اَسْكُتُوْا لَا يَسْمَعْنَ سَوًى ۙ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِىْ بِرَ لٰكِنْ صَفِيْٓتْ صَبْرٌ ۙ اَسْ سِىٰ كُوْ حَالِيْٓتْ نَعْبِ مِیْ كَر دِیَا ہے جس سے اس کے معنی میں یہ اسناد ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی وفاداری کا حق ادا کرنے والے خاص طور پر وہ لوگ ہوں گے جو فقر و فاقہ، جسمانی تکالیف اور جنگ کے مصائب کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنے والے ہوں گے۔

یہی بات اس باب کی آخری بات ہے۔ ظاہر ہے کہ جب وفاداری بشرط استواری مطلوب ہے جس کے بغیر ایمان، ایمان نہیں، بلکہ صریح نفاق ہے تو اس کے لئے سب سے بڑی شرط صبر یعنی عزیمت و استقامت ہی ٹھہرے گی۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کو مخاطب کر کے سرزنش کی ہے کہ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ تم ایمان کا دعویٰ کر کے اپنے کو اہل ایمان میں شمار کرالو گے اور تمہارے جھوٹے اور سچے میں امتیاز کے لئے اللہ تعالیٰ تمہیں کسی امتحان میں نہیں ڈالے گا؟ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر مدعی کے لئے جگہ نہیں ہے۔ اس کے ہاں شرف باریابی صرف انہی کو حاصل ہو گا جو ہر قسم کے امتحانوں سے گزر کر یہ ثابت کر دیں گے کہ انہوں نے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کا جو عہد کیا ہے اس میں وہ بالکل سچے اور یکے ہیں۔ فرمایا کہ: اُوْلٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا یہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے ہاں راست باز ٹھہریں گے اور اُوْلٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ اور یہی لوگ ہیں جو اسکی نگاہوں میں حقیقی متقی ہیں۔

(تدبر مئی ۱۹۹۳ء)